اس مکان میں ہم اٹھارہ مرد رہتے تھے۔ یہ مکان مدت سے مسماری کے پروگرام میں آچکا تھا، مگر ابھی تک کھڑا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں پہلے پہل اپنے ملک کو چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ شہر لندن میں میں ایک ہفتے تک ٹھہرا رہا، مگر وہاں میرا کام نہیں بنا۔ جو آدمی ہمیں ادھر لے کر آیا تھا وہ جاتے جاتے ایک دو پتے دے گیا تھا، تاکہ سر چھپانے کی جگہ مل جائے۔ ایک پتے کو پوچھتا ہوا میں برمنگھم آنکلا۔ یہاں پہنچ کر قسمت نے مدد کی، دو چار دن کے اندر ہی مجھے کام مل گیا اور میں یہیں پر رُک گیا۔ اس طرح اگلے دو سال کے لیے برمنگھم میرا شہر، اور وہ مکان میرا گھر بن گیا۔ پھر اُس گھر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے بم کے دھماکے کی طرح اُچھال کر ہمیں اِدھر اُدھر بکھیر دیا۔ ہم سب غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے تھے اور کام کاج کر رہے تھے۔ جس روز وہ واقعہ پیش آیا ہم سب اٹھ کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جو چار پانچ آدمی اُس وقت گھر میں موجود تھے ان کو سامان باندھنے کا موقع مل گیا۔ باقی کے باہر ہی باہر سے غائب ہو گئے۔ جس طرف کسی کا منہ اٹھا اسی طرف کو نکل گیا۔ میں گرتا پڑتا ہوا اسکاٹ لینڈ جا پہنچا اور کئی برس تک گلاسگو میں رہتا رہا۔ اس بات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے، مگر اُس

دن سے لے کر آج تک مجھے ان آدمیوں میں سے کسی ایک کی شکل نظر نہیں آئی۔ میں سوچتا ہوں ہیر کا چکر تو قسمت کا چکر ہے، ایک زندگی کا چکر الگ ہے جو اس سے بھی اندھا چکر ہے۔ اُس زمانے سے صرف ثاقب ایک ایسا آدمی ہے جس سے سال میں ایک دو بار ملاقات ہو جاتی ہے۔ مگر ثاقب کی بات دوسری ہے۔ اوّل تو اُس کی ایک خاص جگہ مقرر ہے جہاں وہ موجود رہتا ہے۔ دوم ثاقب کا اس واقعے سے گہرا تعلق ہے جس نے ہمارے بسے بسائے گھر کو اُجاڑ کے رکھ دیا ہے۔

اب زندگی خاصی آسان ہو گئی ہے۔ کئی سال کی دربدری کے بعد اب مجھے اس ملک کی شہریت مل چکی ہے۔ آخری دنوں میں اپنے ہی ایک آدمی نے مخبری کر دی تھی جس کی وجہ سے مجھے تین مہینے کی جیل کاٹنی پڑی۔ مگر خوش قسمتی سے انھیں دنوں کے اندر یہاں کا قانون بدل گیا۔ اس سے پہلے میرا وکیل مقدمہ لڑ رہا تھا۔ اس نے حکومت کو بتایا کہ مجھے یہاں رہتے ہوئے اور کام کرتے ہوئے پانچ سال سے زائد ہو گئے ہیں اور میں نے پورا ٹیکس ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں کسی چھوٹے بڑے جرم میں ملوث نہیں ہوا۔ مارگریٹ میکنگرٹ کا قصہ بھی بیچ میں آ گیا جس کے ساتھ گلاسکو میں میرا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ میں اسی کے گھر میں رہائش پذیر تھا۔ مارگریٹ سے میرا ایک بیٹا بھی تولد ہوا تھا، گو نکاح کی نوبت کبھی نہیں آئی، نہ ہی میرا کوئی ارادہ تھا۔ کیوں کہ میرے بیوی بچے پیچھے موجود تھے۔ میری کوشش تھی کہ اس قصے کا ذکر بیچ میں نہ لایا جائے۔ مگر میرے وکیل نے بتایا کہ ادھر یہ کوئی غیر قانونی بات نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے میرا کیس اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پھر اس دوران میں ملک کا قانون بدل گیا اور مجھے یہاں رہنے کی کھلی آزادی مل گئی۔ اسکاٹ لینڈ کی سردی نے میری ہڈیاں جما دی تھیں۔ آزاد ہوتے ہی میں وہاں سے منتقل ہو کر ادھر لندن

کے قریب آ گیا۔ یہاں کا موسم اچھا ہے اور مجھے پوسٹ آفس میں ملازمت مل گئی ہے۔ حکومت کی پکی نوکری ہے اس میں اوور ٹائم بہت لگتا ہے جتنی ڈیوٹی اتنا اوور ٹائم۔ میں نے اپنا مکان خرید لیا ہے اور اپنے بیوی بچوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا ہے۔ مارگریٹ سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا، بس اپنے بیٹے ماجد کو، جس کا نام میں نے اپنے چچا کے نام پر رکھا ہے، باقاعدگی سے خرچہ بھیجتا ہوں۔ وہ آرام سے مارگریٹ کے دوسرے دو بچوں کے ہمراہ پرورش پا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کیا فرق پڑتا ہے، یہاں رہے یا وہاں، آخر بیٹا تو میرا ہی ہے۔ بڑا ہو گا تو ایک دن خود ہی چل کر میرے پاس آ جائے گا۔ میرے بچے اب میرے پاس رہتے ہیں اور انگریزوں کی طرح انگریزی بولتے ہیں۔ زندگی اب کافی مطمئن ہو گئی ہے۔ مگر دن رات یہاں پر سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ آج کل میں ہسپتال میں پڑا ہوں تو کچھ فرصت ملی ہے، دن بھر خاموش لیٹا رہتا ہوں، پرانی پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ ساری عمر میں پہلی بار ہسپتال میں داخل ہوا ہوں۔ اپنی طرف تو ہسپتال میں داخل ہونے کا رواج ہی نہیں تھا۔ گھر پر پڑے پڑے درست ہو جایا کرتے تھے۔ ویسے بھی میری صحت اچھی واقع ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے، کبھی کوئی بیماری نہیں لگی۔ یہ بھی ایک معمولی سے حادثے کی وجہ سے ہسپتال میں آنا پڑا ہے، کوئی بیماری وغیرہ نہیں۔ میرے بس میں ہو تو ابھی اٹھ کر کام پر چلا جاؤں۔ مگر یہاں ڈاکٹر کا حکم چلتا ہے۔ مجھے لٹا رکھا ہے کئی دن سے ٹسٹ ہو رہے ہیں۔ ویسے میں آرام سے ہوں۔ ہسپتال کیا ہے ایک عالیشان عمارت ہے جیسے کوئی محل ہو۔ چمکتا ہوا فرش اور سفید براق بستر۔ نرسیں اور ڈاکٹر زیادہ تر ہمارے وطن کے ہیں یا افریقہ کے کالے ہیں۔ ان کی وردیاں بھی سفید براق ہیں۔ کھانے کا انتظام بہت عمدہ ہے، پیشاب پاخانے کے

برتن صاف ستھرے ہیں، جیسے کوئی اعلا درجے کا ہوٹل ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ جب سے یہاں پر آیا ہوں میرے دل میں بے وطنی کا احساس بڑھ گیا ہے اور کوئی تکلیف نہیں۔ مگر دل بے چین رہنے لگا ہے۔ پہلے پہل کی باتیں خیال میں آتی رہتی ہیں، اپنے ملک کی باتیں اور اس ملک کی باتیں، جیسے پچھلی زندگی آنکھوں کے سامنے سے گزرتی جارہی ہو۔

ایک خاص بات ان دِنوں میں ایسی ضرور ہوئی ہے جس کی وجہ سے برمنگھم کا زمانہ مجھے ہر وقت یاد آتا رہتا ہے۔ ہسپتال میں آنے سے کچھ دن پہلے میں ثاقب سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ وہاں میں نے ثاقب کی واپسی کی خبر سنی، جس نے میرے دل کو بے حد رنجیدہ کر دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اُس زمانے کی ایک ایک بات میرے دماغ میں آتی چلی جاتی ہے، جیسے ایک لڑی میں پروئی ہوئی ہو۔ اور برمنگھم کا وہ مکان جہاں میں نے پہلے دو سال گزارے تھے ایک تصویر کی طرح میرے دل میں آموجود ہوتا ہے۔ جب سے میں نے وہ جگہ چھوڑی ہے میں وہاں لوٹ کر نہیں گیا۔ اطلاع یہ ہے کہ وہ سارے کا سارا علاقہ میونسپلٹی نے گرا دیا ہے اور اس کی جگہ نئے مکان بن رہے ہیں۔ مگر جہاں تک میری یاد کا تعلق ہے وہ مکان ویسے کا ویسا اپنی جگہ پر کھڑا ہے، جیسے کل کی بات ہو۔

اُس مکان میں ہم اٹھارہ مرد رہتے تھے۔ مکان کا مالک ایک بڈھا یہودی تھا۔ جنگ کے بعد اس نے کئی پرانے مکان سستے داموں خرید لیے تھے۔ یہ مکان اُس نے کرایے پر چڑھا رکھے تھے اور خود شہر کے ایک امیر علاقے میں رہتا تھا۔ کسی زمانے میں ہمارا علاقہ بھی اس شہر کے صاف ستھرے علاقوں میں گِنا جاتا تھا۔ یہاں محنت

مزدوری کرنے والے خانہ دار لوگ ایک ایک دو کمرے کرایے پر لے کر رہتے تھے۔ رضا علی نے مجھے بتایا تھا کہ ان لوگوں کی عورتیں شام کے وقت فٹ پاتھوں کی صفائی کیا کرتی تھیں۔ رضا علی اُس وقت اِس ملک میں آیا تھا جب جنگ نئی نئی ختم ہوئی تھی۔ مگر انہیں سو پچاس کے بعد یہاں پر بڑی تعداد میں دوسرے ملکوں سے لوگ آنے شروع ہوئے۔ زیادہ تر ہمارے وطن کے لوگ اور افریقہ کے کالے لوگ تھے۔ پانچ دس سال کے اندر گوروں کے اس شہر میں نیلے پیلے لوگوں کی کثرت ہو گئی۔ پیسا دیکھ کر ان لوگوں نے ایسی جان ماری کہ اپنے مکان خریدنے کے قابل ہو گئے۔ اُس زمانے کی یہ سب باتیں مجھے رضا علی کی زبانی معلوم ہوئی تھیں۔ رضا علی سُورت کا رہنے والا تھا۔ اس نے بارہ سال کی عمر میں بحری جہازوں پر کام کرنا شروع کیا تھا اور ساری زبانیں بول لیتا تھا۔ سورتی، بنگالی، مدراسی، پنجابی سب۔ ایک بار اُس کا جہاز اُس ملک سے گزرا تو رضا علی یہیں پر رہ گیا۔ میرے خیال میں وہ اس جگہ کا سب سے پرانا رہنے والا تھا۔

رضا علی کا کہنا تھا کہ کرایے کے مکانوں کی وجہ سے یہ علاقہ پہلے ہی کافی خستہ حال ہو چکا تھا۔ پھر ہمارے لوگوں کی شکل دیکھتے ہی گورے لوگ یہاں سے بھاگنے لگے۔ مکانوں کی قیمتیں گر گئیں اور اپنے لوگوں نے آسان قسطوں پر ان کے مکان خرید لیے۔ جو کرایے دار گورے آپ سے آپ گئے وہ گئے، جو نہ گئے ان کو مرحوں کی دُھونی دے کر نکالا گیا۔ ان کی جگہ وطن سے نئے آنے والوں کو کمروں میں بھر لیا گیا۔ جب ہمارے لوگوں کی آبادی بڑھی تو اپنی دکانیں کھلنے لگیں۔ آٹا، دال، مرچ، گرم مسالا، حلال گوشت، جھٹکا گوشت،

اصلی گھی کی مٹھائیاں، سرسوں کا ساگ، کریلے، سبز مرچ، آہستہ آہستہ سب کچھ ملنے لگا۔ دیسی کھانے کے ہوٹل کھل گئے۔ اب تو یہ حالت ہے کہ گورے لوگ بھاگ بھاگ کر ہمارے ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ سالن روٹی کھاتے ہیں اور پانی کے گلاس چڑھا کر ڈکار لیتے ہیں۔ مگر پہلے پہل سنا ہے کہ ادھر سے گزرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ بڑی بڑی گلیوں میں رہنے والے لوگوں نے میونسپلٹی سے اجازت حاصل کر کے اپنے گھروں کی بیٹھکوں میں چھوٹے چھوٹے کیفے کھول لیے۔ یہ کیفے اس وقت ان بے وطنوں کی زندگی کا مرکز ہوا کرتے تھے۔ آج کل تو نقشا بدل چکا ہے۔ ہم لوگ اب اس ملک میں رہنے سہنے لگے ہیں۔ کام کاج ہے۔ بیوی بچے ہیں، آپس کی میل ملاقات ہے، مندر اور مسجدیں تیار ہو گئی ہیں، کمیٹیاں بن گئی ہیں، جیب میں پیسا ہے، کار ہاتھ کے نیچے ہے، نیلی وژن لگا ہوا ہے، بچوں کی برتھ ڈے ہوتی ہے، وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ ان دنوں میں یہ چیزیں ابھی جاری نہیں ہوئی تھیں۔ یہ کیفے ہی ایسی جگہیں تھیں جہاں وقت گزرتا تھا اور روزگار کے بارے میں معلوم کیا جاتا تھا۔ اپنے اپنے علاقوں کے لوگ گروہ بنا کر میزوں کے گرد بیٹھے رہتے تھے۔ نئے آنے والوں کو ملک کے طور طریقے اور دفتری کارروائیاں سمجھائی جاتی تھیں۔ سارا دن ریکارڈ بجتے رہتے تھے۔ یہ کیفے شاید پہلی ایسی جگہیں تھیں جہاں سے اس سرزمین پر ہماری غزلوں اور قوالیوں کی سُریلی آواز بلند ہوتی تھی۔ کئی سال کے بعد انھیں کیفوں میں سے ایک تھے اندر رضا علی سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ سارا دن وہ ایک سے دوسرے کیفے میں آتا جاتا رہتا۔ اس

کا کسی ایک گروہ کے ساتھ میل جول نہ تھا بلکہ بنگالیوں پنجابیوں سب کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ لوگ سارا دن اس کو چائے خرید خرید کر پلاتے رہتے تھے، کیوں کہ رضا علی یہاں کی سب دفتری کارروائیاں سمجھتا تھا اور ہر مسئلے پر اپنی رائے دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ رضا علی دل کا بہت اچھا تھا۔ اس کی زندگی عجیب گزری تھی۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے سمندری جہازوں پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ سال میں ایک دو بار وہ اپنے گاؤں کا چکر لگا آتا تھا۔ ایک بار وہ گاؤں گیا تو اس کی شادی ہو گئی۔ اس وقت وہ سولہ سال کا تھا۔ رضا علی کی ایک لڑکی تھی جو شادی شدہ تھی۔ رضا علی کے پاس تصویریں تھیں جو اس نے مجھے دکھائیں۔ زیادہ تر اس کی اپنی جوانی کی تصویریں تھیں جن میں وہ اپنے جہازی دوستوں کے ساتھ گلے میں بانہیں ڈالے بندرگاہوں پر اور جہازوں پر کھڑا تھا۔ باقی اس کی بیٹی کی تصویریں تھیں۔ اس کی بیٹی کے بچپن، جوانی اور شادی شدہ ہونے کی تصویریں تھیں۔ کچھ اس کی بیٹی کے بچوں کی تصویریں تھیں۔ ان بچوں کو رضا علی نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی تصویریں اس نے لفافے میں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ رضا علی نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی عمر میں صرف دس پندرہ مرتبہ اپنی بیوی سے ملا تھا، اور کبھی ایک مہینے سے اوپر اس کے ساتھ نہیں رہا۔ مگر چالیس سال سے باقاعدہ اس کو خرچہ بھیج رہا ہے۔ "جدھر بھی گیا" وہ بتایا کرتا تھا، "میں تاریخ کو پیسا پیچھے بھیج دیا۔ کبھی ناغہ نہیں کیا، وہ تیس سال سے اس ملک میں ایک کمرے کے اندر رہ رہا تھا۔ اس عرصے میں صرف ایک بار دو ہفتے کے لیے پیچھے اپنے گاؤں کو گیا تھا، جب اس کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی میں نے ایک بار اس سے دریافت کیا کہ وہ اپنی بیوی کو ادھر کیوں

نہیں لے کر آیا، تو بولا اس کی بیوی اُدھر گاؤں میں خوش ہے۔ بس پہلے پہل سنا تھا کہ رضا علی یہاں کچھ عرصے تک ایک گوری عورت کے ساتھ رہتا رہا تھا، مگر پھر اُسے چھوڑ کر الگ اپنے کمرے میں آگیا۔

اِدھر وہ سالوں سال چھوٹی موٹی فیکٹریوں میں کام کرتا رہا اور شام کو کیفوں اور پبوں میں بیٹھ کر اپنے لوگوں سے آہستہ آہستہ باتیں کیا کرتا۔ جیسے کوئی منتر جپ رہا ہو۔ اُس کی زندگی اسی طرح دن بہ دن گزرتی تھی۔ دیکھنے میں لگتا تھا کہ سو سال تک اسی طرح چلتا جائے گا۔ مگر آخری دنوں میں اُس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ جب میرا اس سے میل جول ہوا اُس کے ایک سال کے اندر اندر اُس کا انتقال ہو گیا۔ کچھ سورتی لوگوں نے مل جل کر سوشل محکمے کی مدد سے رضا علی کے کفن دفن کا انتظام کر دیا۔ محکمے والوں نے اس کے پرانے کپڑے جلا دیے اور کاغذات اور تصویروں کا بنڈل بنا کر ڈاک کے ذریعے اُس کے پتے پر پیچھے گاؤں بھیج دیا۔ رضا علی نے کوئی ترقی نہیں کی جس سے زمانے میں وہ آیا تھا محنت کر کے بہت ترقی کر سکتا تھا۔ مگر رضا علی کی عادت پکی ہو چکی تھی۔ وہ سمندری جہازوں کی طرح اِدھر سے اُدھر ہی آتا جاتا رہا۔ وہ بڑا سخت زمانہ تھا۔ ہم لوگ تو بعد میں یہاں پہنچے ہیں۔ مگر پہلے پہل کے وہ دن اس ملک میں ہمارے لوگوں کے لیے اصل بے وطنی کے دن تھے۔ حالاں کہ ہم لوگ جب یہاں آئے اُس وقت بھی زندگی آسان نہ تھی۔ آج کل تو حالت بڑی بہتر ہو گئی ہے، مگر ہمارے وقت میں بھی مارا ماری کا عالم تھا۔ لوگوں کے آنے جانے پر بندش لگ چکی تھی۔ یہودیوں کے شور مچانے پر حکومت نے قانون بدل دیا تھا اور ہم لوگوں کا داخلہ اِدھر بند ہو گیا تھا۔ پھر اسمگل کرنے کا کاروبار شروع ہوا۔ ہمارے وقت کے سب لوگ اسمگل ہو کر اِدھر آئے تھے۔ میں نے خود اپنی

بیوی کا زیور بیچ کر پانچ ہزار کی رقم خرچ کی تو پھر ایجنٹ نے پاسپورٹ بنوا کر دیا۔ وہ بھی جعلی۔ اس کے بعد ہم جس طرح لاریوں اور ٹرکوں میں چھپ چھپا کر یہاں تک پہنچے، اور راستے میں ہم پر کیا گزری، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ پھر یہاں پہنچنے کے بعد مزید قرضہ سر پر چڑھا۔ اس زمانے میں کارڈ پچاس پونڈ کا بنتا تھا۔ پھر کام حاصل کرنے کے لیے سو پونڈ اپنے ہی ایک بھائی کو دینے پڑے جس نے فورمین سے کہہ سن کر اپنی فیکٹری میں کام پر لگوا دیا۔ یہ قرضے اور اس ایجنٹ کے قرضے جس نے ہم کو یہاں اسمگل کیا تھا اتارتے اتارتے دو سال لگ گئے۔ پھر اوپر سے گرفتاری کا فکر، کہ پکڑے گئے تو سب کچھ غارت مگر کم از کم ایک بات کی تسلی تھی۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر تھے۔ ایک بار ادھر کے طور طریقوں کا علم ہو گیا تو پھر کچھ آزادی سے گھومنے پھرنے لگ گئے۔ مگر پہلے پہل ہم سب اس مکان کے اندر بند ہو کر بیٹھے رہتے تھے۔ جیسے اٹھارہ قیدی ہوں۔ ان دنوں میں جیسی واقفیت میری اس گھر سے ہوئی شاید کسی قیدی کی قید خانے کی دیواروں سے بھی نہ ہوگی۔

ہماری ساری زندگی گھر کے اندر بسر ہوتی تھی۔ جو زندگی گلیوں اور بازاروں میں اور کچھ دوستوں، عزیزوں سے ملنے ملانے میں اور کچھ سیر و تفریح میں گزر جاتی ہے، ہماری وہ ساری کی ساری گھر کی چہار دیواری کے اندر گزرتی تھی۔ یہودی بڑی چالاک قوم ہے۔ انھوں نے اپنا ایک مکان بھی ہمارے لوگوں کے ہاتھ نہ بیچا بلکہ صرف کرایے دار بدل دیے۔ اب گوروں کی بجائے ہمارے لوگ ان کے کرایے دار بن گئے۔ ان مکانوں کی مرمت پر وہ ایک پیسا بھی خرچ نہ کرتے تھے اور کرایہ ڈبل لیتے تھے۔ ہمارا اسی طرح کا مکان تھا

جس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا بنا ہوا مکان تھا اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس وقت سے لے کر آج تک اس کا پلستر اکھڑ رہا ہے۔ دیواروں پر سیل چڑھی ہوئی تھی اور جگہ جگہ پر پلستر کے ڈھول بنے ہوئے تھے۔ چھتوں سے ہر وقت سفیدی کے ذرّے گرتے رہتے تھے جیسے برفباری کی پھوار پڑتی ہے یہ چونا سانس کے اندر جاکر صحت کے لیے بڑا خطرناک ثابت ہوا۔ کئی ایک کو خشک کھانسی لگ گئی۔ نزلہ، زکام، کھانسی، بلغم، چھاتی کا درد سارے گھر میں پھیل گیا۔ غلام محمد بیچارے کو نمونیہ ہوگیا۔ کئی دن تک پڑا پڑا کراہتا رہا۔ قسمت اچھی تھی بچ گیا۔ آہستہ آہستہ ڈاکٹروں کے پاس جانے لگے تو کچھ آرام ملا۔ مگر پہلے چھے مہینے تک کسی کی ہمت نہ پڑی کہ ڈاکٹر کا کارڈ بنوائے، اس ڈر سے کہ ڈاکٹر حکومت کو شکایت نہ کردے۔ مگر یہاں کے ڈاکٹر اچھے ہیں، ان کا کام صرف بیماری کا علاج کرنا ہے۔ ہمارے ڈاکٹروں کی طرح لالچ نہیں کرتے۔ اور نہ غلط دوائی دیتے ہیں۔ جب چھے مہینے کے بعد ڈاکٹری کارڈ بنوالیے تو پھر بھی کبھی ڈاکٹر کو گھر پر نہیں بلایا۔ حالاں کہ ٹیلی فون لگا ہوا تھا اور کارڈ کے اوپر درج تھا کہ ڈاکٹر کو گھر پر بلانے کا ہم کو حق ہے۔ مگر اس زمانے میں ہم کو کس چیز کا حق تھا۔ پیٹ پالنے کا چارہ کر رہے تھے ہیں تو کہتا ہوں کہ ہم ایک پودا لگانے یہاں آئے تھے، وہ لگا دیا ہے۔ نئی زمین پر قدم جمانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ یہ زندگی کا اصول ہے۔ کوئی زمانہ آسان نہیں ہوتا۔ اب حالت بہت بدل چکی ہے مگر نئے آنے والے سے پوچھ کر دیکھو تو پتا چلتا ہے۔ سب زمانے سخت ہوتے ہیں۔ پھر بھی، آج کل کئی باتیں بہتر ہوگئی ہیں۔ نئے مکانوں کے نقشوں پر قانون لاگو ہوگئے ہیں۔ ہواداری کا انتظام ضروری ہوگیا ہے۔ جگہ

تھوڑی ہوتی ہے مگر دیواروں میں ہر طرف کھڑکیاں ہوتی ہیں کھڑکیوں میں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ سارے گھر میں روشنی آتی رہتی ہے۔ ہمارے اس مکان کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کیونکہ پرانے زمانے میں زمین کافی ہوتی تھی، مکان بڑے بڑے ہوا کرتے تھے۔ مگر کھڑکیاں تنگ ہوا کرتی تھیں، جیسے گرجوں میں ہوتی ہیں لمبے لمبے غار نما مکان ہوتے تھے جن میں کئی بڑے اور چھوٹے کمرے ہوتے تھے۔ ہمارے مکان میں دس کمرے تھے۔ کمرے اصل میں نو ہی تھے۔ دسواں ایک چھوٹا سا کابک نما کمرہ چھت میں تھا جو اٹک کہلاتا تھا۔ اس گھر کا ایک تہ خانہ بھی تھا جسے انگریزی میں سیلا کہتے تھے۔ یہ واقعی سیلا تھا یعنی اس کے اندر ایک ایک فٹ پانی کھڑا رہتا تھا۔

پہلی منزل پر تین کمرے تھے جن میں چھ میرپوری رہتے تھے۔ اس کے علاوہ باورچی خانہ اور باتھ تھے۔ دوسری منزل پر چار کمرے تھے ان میں چھ حافظ آبادیوں کے ایک گاؤں کے آدمی اور دو بنگالی رہتے تھے۔ تیسری منزل پر دو کمرے تھے۔ یہ دونوں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ایک میں میں اور غلام محمد رہتے تھے اور دوسرے میں حسین شاہ اکیلا رہتا تھا۔ آخری آدمی ثاقب تھا جو چھت کے اندر اپنی کبوتر کی کابک میں رہتا تھا۔ ہمارے دروازے کے باہر لکڑی کی ایک سیڑھی کھڑی رہتی تھی۔ ثاقب یہ سیڑھی لگا کر اوپر چڑھتا تھا اور چھت میں سے ایک چوکور پھٹا ہٹا کر اٹک تک پہنچتا تھا۔ یہ پھٹا اٹک کا دروازہ تھا۔ پھر وہ ہاتھ اندر جماتا اور اچک کر اٹک میں داخل ہو جاتا۔ وہاں وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے جھک کر وہ بوٹ اتارتا اور پھر پاؤں اندر کھینچ لیتا۔ اندر کھڑے ہونے یا مڑنے کی جگہ نہ تھی۔ صرف اتنی جگہ تھی کہ بستر کا گدا فرش پر آ جائے۔ ثاقب بیٹھا بیٹھا اپنے

آپ کو گھسیٹ کر گدّے پر لیٹ جاتا تھا۔ اندر ایک بلب لگا تھا جو بجلی کے تار کے ذریعے کیل کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ دیوار پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے جن میں ثاقب کی چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ اس کے دو تین کپڑے تھے جو تہ کر کے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ چھت میں ایک طرف چھوٹی سی ترچھی کھڑکی تھی جس میں اندھا شیشہ لگا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ثاقب دن بھر کی مزدوری کرنے اور پھر اُپک کر چھت میں چڑھنے کی محنت سے تھک کر ہار جاتا اور اس میں اتنی ہمت نہ رہتی کہ ہاتھ لمبا کر کے بٹنوں کے تسمے کھولے۔ ایسے موقعوں پر وہ کئی کئی منٹ تک اسی طرح ٹانگیں لٹکائے بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی وہ بلب جلا کر اپنے رسالوں کے خانے سے ایک رسالہ اٹھا لیتا اور اسے پڑھنے لگتا۔ ہم لوگ کبھی کبھی فلمی رسالوں کی ورق گردانی کیا کرتے تھے۔ ثاقب نے کبھی فلمی رسالے کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اس کے پاس اُردو کے ادبی رسالے ہوتے تھے۔ جب وہ کوئی رسالہ اٹھا لیتا تو ایک ایک گھنٹے تک پڑھتا رہتا اور اسے بوٹ اتارنے کا ہوش نہ رہتا۔ اُس وقت عجیب منظر ہوتا۔ چھت کی موری سے دو ٹانگیں لٹک رہی ہوتیں اور تھرکتی رہتیں، جیسے کوئی مرا ہوا ہو۔ غلام محمد کا دل گھبرانے لگتا۔ جب کافی دیر گزر جاتی تو غلام محمد کی برداشت ختم ہو جاتی۔ وہ بار بار دروازے سے سر نکال کر دیکھتا اور کہتا "اوئے ثاقبا، تیرے پیر سوج جائیں گے۔ بوٹ اتار دے" ثاقب اپنے اٹک میں خوش تھا۔ اُسے صرف پچاس شلنگ کرایہ دینا پڑتا تھا۔ ایک سال کے بعد جب ہمارے کرایے ڈبل ہو گئے تو اس کا صرف پندرہ شلنگ ہوا۔ یہودیوں نے ان مکانوں کی مرمت کرانی چھوڑ دی تھی۔ ان کو پتا تھا کہ اس سارے محلّے کی حالت خستہ ہو رہی ہے، کبھی نہ کبھی حکومت ان کی قیمت

ادا کرکے انھیں گرا دے گی۔ چنانچہ اوپر پیسا صرف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آہستہ آہستہ سب بڑے مکان مسماری کے پروگرام میں آگئے۔ مگر ان پروگراموں کو پورا ہوتے ہوئے وقت لگتا ہے۔ مالکوں کی پالیسی یہ تھی کہ جب تک کھڑے ہوئے ہیں ان سے پیسے پیدا کرلو۔ اسی زمانے میں اسمگلنگ کا کاروبار شروع ہوگیا۔ مالک مکانوں کے مزے ہوگئے۔ ہمارے جیسے غیر قانونیوں کو سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے تھی۔ منہ مانگے پیسے دینے کے لیے تیار تھے۔ ان مالکوں نے ڈبل کرایہ لگا کر ہمارے لوگوں کو مکان میں بھر لیا۔ کسی نے ذرا چوں کی تو اس کی خفیہ رپورٹ کردی وہ بے چارا کام پر ہی پکڑ لیا گیا۔ افسوس کی بات ہے مگر سچی ہے کہ ان مالک مکانوں میں بہت سے ہمارے لوگ بھی تھے۔ انھوں نے بھی یہی دھندا کیا۔ مگر میں ان کو برا نہیں کہتا۔ وہ تو ہماری طرح بے وطن تھے۔ اور پیر جمانے کے لیے یہ سب کر رہے تھے۔ یہودیوں کو کس بات کی کمی تھی؟ ہوتے ہوتے ہمارے محلّے کا نقشا ہی بدل گیا۔ رنڈیوں کو جب پتا چلا کہ اس علاقے میں ان کی مانگ ہے تو سب کی سب اٹھ کر ادھر آگئیں۔ مالک مکانوں کے لیے وہ بھی ہماری طرح نفع بخش تھیں، غیر قانونی دھندا کرتی تھیں اس لیے منہ مانگے پیسے دینے کے لیے تیار تھیں۔ انھیں دور نہیں جانا پڑتا تھا، اس علاقے میں ان کے بنے بنائے گاہک موجود تھے۔ جب یہاں میں پہنچا تو اس وقت اس علاقے میں دو طرح کے لوگوں کی آبادی تھی۔ غیر قانونیوں کی اور رنڈیوں کی۔ باقی کیٹنوں اور بچوں والے تھے ہم لوگ ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے تھے۔ کہیں کہیں دو چار اسٹوڈنٹ ایک کمرہ کرایے پر لے کر رہا کرتے تھے۔ مالک مکانوں کو ہر طرف سے ڈبل فائدہ تھا۔ ہمارا کرایہ ایک سال کے اندر تین پونڈ سے چھ پونڈ ہوگیا۔ مگر ہماری بہتری اسی

میں تھی کہ چپ چاپ ادا کر دیں۔ ہمارا اور کوئی خرچہ نہ تھا، صرف روٹی پانی اور بس کے کرایے کا خرچہ تھا۔ باقی سارا پیسا پیچھے جاتا تھا یا جمع ہوتا تھا۔

ایک سال تک ہماری زندگی اسی مکان کے اندر گزری۔ مکان کی تین منزلیں تھیں اور ایک اٹک۔ مگر آبادی کے حساب سے دو حصوں میں بٹا ہوا تھا یہ بٹائی باورچی خانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ پہلی دو منزلوں کا باورچی خانہ نیچے تھا جس میں باقاعدہ الماریاں اور خانے تھے اور میز اور دو کرسیاں بھی ہوئی تھیں۔ ہماری منزل کا باورچی خانہ ہماری سیڑھیوں کے اوپر تھا۔ باورچی خانہ کیا تھا، چھوٹے سے گزرنے والے رستے میں مالک نے گیس کا چولھا رکھ دیا تھا۔ پاس ایک چھوٹی سی میز تھی اور دیوار کے ساتھ پانی کی ٹوٹی اور سین لگا ہوا تھا۔ میں، غلام محمد حسین شاہ اور ثاقب یہیں پر کھاتے پکاتے تھے۔ ثاقب نے کبھی کھانا نہیں پکایا تھا۔ اس کو کھانا پکانا آتا ہی نہ تھا۔ وہ ہفتے کے دن سات دن کے کھانے کی چیزیں خرید کر لے آتا اور حسین شاہ کو دے دیتا۔ حسین شاہ اس کا روٹی سالن پکاتا تھا۔ حسین شاہ چٹا ان پڑھ تھا۔ ثاقب بدلے میں اس کی ساری خط و کتابت کرتا، اس کی خریداری کر کے لاتا، اور کبھی کبھی اس کے کپڑے بھی دھو دیا کرتا تھا۔ مگر حسین شاہ اس کے علاوہ بھی ثاقب سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ یعنی وہ ثاقب کو ہفتے کا کھانا پکانے کی چیزیں لکھوا دیتا اور ثاقب خرید کر لے آتا، مگر حسین شاہ ثاقب کے حصے میں سے آدھا خود کھا جاتا اور آدھا ثاقب کو پکا کر دیتا۔ حسین شاہ کیمبل پور کے گانو کا رہنے والا پٹھان تھا۔ وہ چھوٹے سے قد اور خوب گٹھے ہوئے جسم والا مضبوط آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور اس کے اگلے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے، جس سے اس کا

چہرہ مزاحیہ شکل کا ہو گیا تھا۔ مگر حسین شاہ کے اندر ایک قدرتی رعب داب تھا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ سختی نہ کی تھی، مگر ہر وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اٹھ کر مار پٹائی شروع کر دے گا۔ اس وجہ سے حسین شاہ جو بات بھی کہتا وہ چوں چرا کے بغیر مان لی جاتی تھی۔ ثاقب کے ساتھ حسین شاہ بہت نرمی اور پیار سے پیش آتا تھا۔ اس نے کئی بار ثاقب کو اپنے کمرے میں منت رہائش کی پیش کش کی تھی۔ مگر ثاقب اپنے آپ میں خوش تھا۔

میرے کمرے کا ساتھی غلام محمد تھا۔ غلام محمد گجرات کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور پہلے فوج میں حولدار ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے چھ مہینے پہلے ادھر آیا تھا۔ جب میں یہاں پہنچا تو غلام محمد کی زندگی سیٹ ہو چکی تھی۔ مجھے اس بات کا اسی دن پتا چل گیا، جب میں پہلی دفعہ اس کمرے میں داخل ہوا۔ کئی برس گزر گئے ہیں مگر آج بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ شام کا وقت تھا۔ اس ملک میں سردیوں کے موسم میں چار بجے ہی رات پڑ جاتی ہے۔ ہر وقت اندھیرا رہتا ہے۔ اوپر سے میں اس مکان میں آ پہنچا جو پہلے ہی سرنگ کی طرح اندھیرا تھا۔ ہمارے کمرے میں اس وقت غلام محمد اکیلا رہتا تھا۔ جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تو اندر کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا تو کچھ بھی نہ ہوا، کمرے میں اسی طرح اندھیرا چھایا رہا۔ میں ٹٹول کر فرش پر پڑے ہوئے گدے پر بیٹھ گیا۔ سیڑھیوں پر بھی اندھیرا تھا۔ جو آدمی مجھے چھوڑنے آیا تھا وہ آدھی سیڑھیوں میں ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ جب سیڑھیاں ختم ہوئیں تو اندھیرے میں مجھے گیس کے چولھے کا ٹھنڈا لگا تھا، جس سے میری ٹانگ کی نالی ابھی تک درد کر رہی تھی۔ وہ پہلا دن مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد رہے گا۔

میں اندھیرے کمرے میں دو تین گھنٹے تک دیوار کے ساتھ بیٹھا رہا۔ حسین شاہ کے کمرے میں بتی جل رہی تھی مگر دروازہ بند تھا۔ پھر اُس نے بتی بجھائی اور دروازہ کھول کر کام پر چلا گیا۔ کمرے میں اب صرف کھڑکی کے راستے گلی کی تھوڑی تھوڑی روشنی آ رہی تھی۔ جب میری آنکھیں اندھیرے سے واقف ہوئیں تو میں نے دیکھا کہ کمرے میں بلب لٹک رہا تھا۔ شاید جل چکا تھا۔ پھر بھی میں نے ہاتھ اٹھا کر دو تین بار بجلی کا بٹن دبایا۔ جس گدّے پر میں بیٹھا اس پر کئی کمبلوں اور چادروں کا اونچا نیچا بستر بچھا ہوا تھا۔ پاس ایک لکڑی کی میز تھی جس کے اوپر کچھ برتن پڑے تھے۔ ٹھیک طرح سے دکھائی نہیں دیتا تھا کہ کس قسم کے برتن ہیں، مگر یہ پتا چلتا تھا کہ برتن ہیں۔ اس کے علاوہ کمرے میں اور کچھ نہیں تھا۔ میرا پیٹ خالی تھا اور مجھے کانپا لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی سیڑھیاں چڑھا اور ایک گدّا اور دو تین کمبل دروازے کے باہر رکھ کر واپس چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر ایک کمبل لیا اور اسے لپیٹ کر پھر گدّے پر بیٹھ گیا۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ بے وطنی کی کیفیت کیا ہوتی ہے تو مجھے صرف وہ وقت یاد آتا ہے اس وقت تک میں سفر کر رہا تھا، میری کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر اُس شام کو مجھے ایک چھت کا سایہ میسّر آ گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اطمینان کیسا۔ میرا پیٹ خالی تھا اور میرا سارا بدن اختیار سے باہر ہو کر کانپ رہا تھا۔ آج بھی کوئی مجھ سے پوچھے کہ بے وطنی کی حالت کیا ہوتی ہے تو مجھے اُس وقت کا خیال آتا ہے۔ جب میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا اور میرا دل خوف سے سکڑ رہا تھا۔ یہ عجیب بات ہے۔ اب ہسپتال میں بھی مجھے اسی بات کا خیال آتا ہے۔ کئی برس گزر گئے ہیں اور اس بات کو یاد کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مگر اب دماغ کو ذرا مہلت ملی ہے تو وہ وقت آنکھوں کے سامنے آ گیا ہے جیسے وہیں پر رُکا ہوا ہو۔ میں سوچتا ہوں گزرا ہوا

وقت کبھی ختم بھی ہوتا ہے یا ہمارے اندر ہمیشہ کے لیے ٹھہرا رہتا ہے؟ میرا پیٹ خالی تھا، یہ مجھے یاد ہے۔ سارا دن بھاگ دوڑ میں کچھ کھا پی نہ سکا تھا۔ جب یہاں پہنچا تو کسی نے مجھ سے بات نہ کی اور نہ کھانے کو پوچھا۔ بس اندھیرے کمرے میں چھوڑ دیا۔ ہوتے ہوتے سب لوگ اپنے کام پر چلے گئے یا کام سے واپس آکر سو گئے۔ میرے اُوپر کمزوری نے غلبہ پایا اور میں اونگھنے لگا۔ ساڑھے آٹھ بجے غلام محمد کام سے واپس آیا۔ میں اس کے پیروں کی آواز سُن کر جاگ پڑا۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر غلام محمد تھوڑی دیر تک مجھے دیکھتا رہا، مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ اور میرے پاس سے گزر کر میز کی طرف چلا گیا۔ اس نے موٹا کوٹ اور سر پر اُبن ڈرا کوروں والی ٹوپی پہن رکھی تھی، جو کانوں کو بھی ڈھک کر رکھتی ہے۔ پانو میں اس نے فوجی فُل بوٹ چڑھائے ہوئے تھے۔ اور اپنی پتلون بوٹوں کے اندر کس رکھی تھی۔ میری آنکھیں اب اندھیرے میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں۔ مگر غلام محمد ابھی باہر سے آیا تھا اور آسانی سے چل پھر رہا تھا، جیسے اس کی نظر کو کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ اس نے اوور کوٹ کی ایک جیب سے ڈبل روٹی اور دوسری سے پکے پکائے لوبیے کا ڈبّا کھولا اور دونوں چیزوں کو میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے چاقو اٹھا کر لوبیے کا ڈبّا کھولا اور اسے فرائی پان میں الٹ دیا۔ فرائی پان کو اٹھا کر وہ باہر لے گیا اور اندھیرے میں گیس جلا کر اسے آگ پر رکھ دیا۔ جب لوبیا تڑو تڑو کرنے لگا تو غلام محمد اسے اندر لے آیا اور گدّے پر بیٹھ کر ڈبل روٹی اور مکھن کے ساتھ جپ جپ کھانے لگا۔ کھاتے کھاتے وہ ڈبل روٹی پر مکھن اس طرح لگا رہا تھا جیسے اینٹوں پر گارا تھوپ رہا ہو۔ پھر وہ ہاتھ روک کر پہلی بار منہ سے بولا:

"آج آئے ہو؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

"کچھ کھایا پیا؟"

میرا پیٹ خالی تھا مگر میں نے کہا: "جی بسم اللہ کرو۔"

غلام محمد نے دو تین منٹ میں خرائی یان پونچھ کر صاف کر دیا۔

پھر وہ برتن کو ایک طرف فرش پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے ٹوپی اور پھر اوور کوٹ اُتارا اور انھیں دروازے کے پیچھے کیل سے ٹانگ دیا۔ پھر آکر گدّے پر بیٹھ گیا اور بوٹ اتارنے لگا۔ میں اس کے گدّے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بوٹ اُتارتے اُتارتے غلام محمد نے کھنی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ "گدّا لے آؤ۔" وہ بولا۔ بس، یہ اس نے آخری بات کی۔ میں گدّا اور کمبل اٹھا کر اندر لے آیا۔ گدّے کو میں نے دوسری طرف فرش پر ڈال دیا۔ اور کمبل رکھ دیے۔ اتنی دیر میں غلام محمد بوٹ اتار چکا تھا۔ اس نے بوٹ جوڑ کر گدّے کے پانو کی طرف رکھ دیے۔ پھر اُس نے بستر پر بیٹھ کر پتلون اتاری اور اسے پھیلا کر بوٹوں کے اُوپر رکھ دیا۔ نیچے اس نے پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ پاجامہ موٹی موٹی جُرابوں کے اندر گھسا تھا۔ غلام محمد نے نہ جُرابیں اتاریں اور نہ سویٹر، صرف قمیص کی کالر والا بٹن کھولا اور کمبل اوڑھ کے سو گیا۔ دو چار منٹ کے اندر وہ خراٹے لینے لگا۔ میں اپنے گدّے کے پاس کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں کمبل اوڑھ کے گدّے پر بیٹھ گیا۔ میری بھوک کچھ دب گئی تھی۔ مگر میرے دل میں ایک خوف تھا جو کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ میری اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ گدّے پر لیٹ کر سو جاؤں۔ وہ پہلی رات بہت سخت تھی۔ صبح سویرے غلام محمد کی گھڑی نے الارم بجایا تو وہ اچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کمبل اتار کر ایک طرف پھینکے۔ پتلون غلام محمد کے پانو کے پاس پھیلی ہوئی تھی۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے گھٹ کر اُس

نے اپنی ٹانگیں سیدھی پتلون میں ڈال دیں۔ پیر دوسری طرف سے نکال کر اس نے نئے بوٹ چڑھائے اور پتلون کو ان کے اندر کس لیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑے ہو کر اس نے پتلون باندھی، کالر کا بٹن بند کیا، اوور کوٹ پہنا اور سر پر ٹوپی جمائی۔ دروازے کے پیچھے ایک چھوٹا سا شیشہ لٹکا ہوا تھا۔ غلام محمد نے اس شیشے میں اپنا منہ دیکھا، مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر انھیں درست کیا اور ٹوپی کو اٹھا کر دوبارہ سر پر جمایا۔ غلام محمد کی آنکھیں اندھیرے سے خوب واقف تھیں۔ اس کے بعد وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ گھڑی کی سوئی چمک رہی تھی۔ غلام محمد دو منٹ کے اندر اندر گھر سے نکل گیا۔ میں اس کی تیزی پر حیران رہ گیا۔ جتنی دیر میں اور غلام محمد ساتھ ساتھ رہے غلام محمد کا یہی دستور رہا۔ اس کی زندگی سیٹ ہو چکی تھی۔ وہ صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکل جاتا اور شام کو ساڑھے آٹھ بجے واپس آتا۔ ہفتے کے سات دن کام کرتا۔ رفع حاجت اور ناشتہ وہ فیکٹری میں جا کر کرتا۔ وہ تین پونڈ کرایہ دیتا تھا اور باقی کل تین پونڈ میں خرچہ پورا کرتا تھا۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے مجھے بتایا کہ پیچھے گاؤں میں اس نے دس کنال زمین خرید لی ہے۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ یہ آدمی سارا دن فیکٹری میں اور ساری رات اندھیرے میں گزارتا ہے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس گھر کے زیادہ تر لوگوں کا یہی دستور تھا۔ کچھ دنوں کے بعد میرا بھی یہی طریقہ بن گیا۔ اسی میں ہماری بہتری تھی۔ منہ اندھیرے کام پر گئے اور اندھیرا پڑے واپس آئے۔ نہ زیادہ منہ ادھر ادھر دکھایا، نہ کوئی خطرہ مول لیا۔ جب میرا کام لگ گیا تو پہلے ہفتے کی تنخواہ سے میں دو بجلی کے بلب بھی خرید کر لایا، جو میں نے اپنے کمرے میں اور سیڑھیوں پر لگا دیے۔ اس طرح کمرے کی کالی رات سے چھٹکارا

حاصل ہوا۔ ثاقب میرے آنے کے تین مہینے کے بعد آیا اور اٹک میں قائم مقام ہوا۔ ثاقب ہم لوگوں سے مختلف تھا۔ میں نے انٹرنس کی کلاسوں تک تعلیم پائی ہے مگر ثاقب نے کالج میں بھی ایک دو سال لگا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ وہ نوعمر لڑکا تھا اور مزاج کا نازک تھا۔ پیچھے اس کا بال بچہ کوئی نہ تھا، صرف ایک ماں تھی جس کو ثاقب مہینے میں ایک خط لکھتا اور مہینے کے بعد کچھ پیسے بھیج دیتا تھا۔ اس وجہ سے وہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرتا، کبھی کبھار فورمین اسے مجبور کرتا تو وہ اوورٹائم لگا لیتا تھا، ورنہ باقی وقت اٹک میں یا ہمارے کمروں میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا۔ دوسرے سب لوگ دیہات کے رہنے والے تھے، صرف ثاقب شہری تھا اور پڑھا لکھا تھا اس لیے جب کبھی کو ضرورت پڑتی ثاقب اس کی انگریزی خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ نیچے کی منزل والوں کی ایک بنگالی کرتا تھا۔ مگر ان لوگوں سے ہمارا واسطہ بہت کم پڑتا تھا۔ کچھ ہفتوں کے بعد ایک دو بار میں نے غلام محمد کو کھانا پکا کر دیا تو اس کو پکا ہوا کھانا کھانے کی عادت پڑ گئی۔ اس طرح سے اوپر کی منزل پر ہم چاروں کا ایک کنبہ بن گیا۔

نیچے والوں سے ہمارا میل ملاپ لین دین زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ آتے جاتے ہوئے سلام علیک ہو جاتی تھی۔ ٹائلٹ ہماری منزل پر اپنا تھا۔ ویسے بھی رفع حاجت کا وقت گھر میں کہاں ملتا تھا، زیادہ تر فیکٹریوں میں جا کر ہوتی تھی، ہمارا ٹائلٹ سب سے زیادہ حسین شاہ استعمال کرتا تھا۔ حسین شاہ راتوں کو ڈیوٹی دیتا تھا اور صبح سویرے گھر آنے کے بعد نماز ادا کیا کرتا تھا، وہ کہتا تھا کہ رات کی ڈیوٹی اس کے لیے خوب سیٹ ہے۔ کیونکہ گھر میں وہ دن بھر نماز کا فرض ادا کر سکتا ہے۔ باقی صرف باتھ کے لیے نیچے جانا پڑتا تھا، وہ بھی اتوار